بشیر احمد ڈار

# ہندو مت، بھگتی اور مسلمان

(۲)

جنوبی ہندوستان میں مسلمان ساتویں صدی عیسوی یعنی پہلی صدی ہجری ہی میں آ پہنچے تھے۔ اسلام سے پہلے عرب تجارتی اغراض سے مدت مدید سے آتے جاتے تھے اور مالابار کے ساحل پر تو ان کا کافی رسوخ تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد یہ تعلقات اور زیادہ گہرے اور وسیع ہو گئے کیونکہ اب تجارت کے علاوہ ان کے قلب و ذہن میں اپنے نئے دین کی اشاعت و تبلیغ کا جذبہ بھی موجزن تھا۔ تاریخوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا مرکز جہاں مسلمانوں نے اس جذبہ کا اظہار کیا وہ سیلون (سراندیپ) تھا۔ تاریخ فرشتہ کا قول ہے کہ ۴۰ ہجری میں سیلون کا بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا۔ عجائب الہند جو ایک قدیم تصنیف ہے (غالباً ۳۰۰ ہجری) اس میں مذکور ہے کہ "سراندیپ اور اس کے آس پاس والوں کو پیغمبر اسلام کی بعثت کا حال جب معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے ایک سمجھدار آدمی کو تحقیق حال کیلئے عرب روانہ کیا۔ وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول اللہ صلعم وفات پا چکے تھے۔ ابوبکر صدیق کی خلافت بھی ختم ہو چکی تھی اور حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ وہ ان سے ملا اور رسالت مآب صلعم کے حالات دریافت کئے۔ حضرت عمرؓ نے بہ تفصیل بیان کئے۔ جب وہ واپس ہوا تو مکران پہنچ کر مر گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا۔ وہ صحیح سلامت سراندیپ پہنچ گیا اور اس نے رسول اللہ صلعم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا، اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور و طریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں۔۔۔ اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اس سبب سے ہے"۔[1] سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کا باعث بھی سیلون میں مسلمانوں کا آباد ہونا ہی تھا۔ یہاں کے راجہ نے ایک دفعہ دوستی اور محبت کے اظہار کے طور پر ان مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو عراق بھیج دیا جن کے سرپرست بغرضِ تجارت وہاں پہنچے تھے لیکن مسافرت میں فوت ہو گئے تھے لیکن خلیج کچھ کے کچھ بحری ڈاکوؤں نے اس جہاز پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا تھا جس کی بنا پر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو سندھ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان آغاز اسلام ہی سے ان علاقوں میں آباد تھے۔

---

[1] سید سلیمان ندوی عرب و ہند کے تعلقات۔

رالفنسن نے تحفۃ المجاہدین کے دیباچے میں ذکر کیا ہے کہ مسلمان عربوں نے مالابار کے ساحل پر ساتویں صدی کے آخر میں پہلی بار اپنی آبادیاں قائم کیں۔ اسی طرح دوسرے مغربی مؤرخین جنہوں نے مالابار کے موپلوں کی تاریخ لکھی ہے اس کی تائید کرتے ہیں۔ ایک مؤرخ سٹروک کہتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے ہی ہندوستان کے مغربی ساحل کے مختلف شہروں میں ایرانی اور عرب سوداگروں نے اپنی آبادیاں قائم کیں اور یہ لوگ بڑی کثرت سے وہاں رہنے لگے۔ انہوں نے ملکی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس طرح ان کی تعداد بڑھنی شروع ہوئی مالابار میں جو مختلف قومیں آباد ہیں مثلاً موپلا اور نائت ان کی تشریح کرتے ہوئے ایک مغربی مصنف رائس لکھتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں حجاج بن یوسف نے بنی ہاشم کے چند افراد پر اتنے مظالم کئے کہ وہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ انمیں سے کچھ ہندوستان کے مغربی ساحل کے ایک حصّے میں آکر آباد ہو گئے۔ اور کچھ راس کماری کے مشرقی طرف۔ انہی لوگوں کی نسل کو آج کل موپلا اور نائت کہتے ہیں۔ تحفۃ المجاہدین کی روایت یہ ہے کہ جب اسلام پر دو سو برس گزرے تو عرب اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم کے نقشِ قدم کی زیارت کے لئے سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں، جا رہی تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار کے شہر کدنکلور (کدنگا نور) کے کنارے آ لگا۔ شہر کے راجہ زیمور (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آ گیا۔ راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمہارے پیغمبر کا اور مذہب کا حال سُنا ہے، اب تم خود سناؤ۔ درویشوں نے اسلام کی حقیقت کو اس مؤثر انداز سے بیان کیا کہ اس نے راجہ کا دل موہ لیا۔ راجہ نے ان سے وعدہ لیا کہ واپسی میں بھی وہ ادھر ہی سے گذرتے جائیں۔ چنانچہ وہ وعدہ کے مطابق آئے۔ راجہ نے سب امرا کو بلا کر کہا کہ اب میں خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر برابر سب افسروں میں تقسیم کر دیا اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا اور ان درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام کے پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت اور سوداگری کا کاروبار شروع کر دو اور اپنے امراء کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کیا کہ ان پردیسی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کی جائے اور ان کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے اور اس طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اور اس کو وطن بنانے کی خواہش پیدا ہو۔ اس وقت سے عرب سوداگر اس ملک میں آنے جانے اور رہنے سہنے لگے۔۔۔[1] کولم کا شہر موجودہ ٹراونکور میں شامل ہے۔ یہاں ایک قبرستان ہے جس میں بعض قبروں پر کتبے موجود ہیں۔ ایک کتبے کی عبارت جس کو ڈاکٹر تاراچند نے نقل کیا ہے یہ ہے: "علی بن عثمان نے

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات ۲۶۵۔ ۲۶۷

سنہ ۱۶۶ میں وفات پائی" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی سے ان علاقوں میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور مستقل آبادی شروع ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر تارا چند نے ایک دوسری روایت کے ذریعہ اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے پہلے ربع میں مالابار کا آخری بادشاہ مسلمان ہو گیا۔ اس نے خواب میں چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے جب یہ خواب بیان کیا تو اس وقت چند مسلمان جو سیلون سے آئے تھے موجود تھے۔ ان مسلمانوں کے سردار نے اس خواب کی تعبیر بیان کی اور اس طرح وہ مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلامی نام عبدالرحمان سامری رکھا۔ اس کے بعد وہ عرب چلا گیا۔ اس نے وہاں جا کر چند برگزیدہ مسلمانوں کو مالابار تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا۔ ان میں ملک بن دینار، شرف ابن ملک، ملک ابنِ حبیب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس واقعہ کا اثر لوگوں کے ذہن پر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ زمورن کی تاج پوشی کے وقت اس کو مسلمانوں کی طرح لباس پہنایا جاتا تھا اور محض مالابار کے آخری تاجدار کے نمائندے کی حیثیت سے حکمرانی کے فرائض سر انجام دیتا تھا جو تخت و تاج کو چھوڑ کر عرب چلا گیا تھا۔ ٹراونکور کے راجہ کی رسم تاجپوشی کے وقت اسے اعلان کرنا پڑتا تھا کہ "میں اس تلوار کو اس وقت تک اپنے پاس رکھوں گا جب تک کہ چچا عرب سے واپس نہیں آتا"[۱] عربوں نے بھی اپنی طرف سے زمورن کی سیاسی اور تجارتی بہتری اور بہبودی کے لئے بڑی کوشش کی۔ کالی کٹ شہر بھی ایک مشہور اور نامور عرب سوداگر کی بدولت فتح ہوا اور جس نے زمورن کو ارد گرد کے علاقوں کو فتح کرنے میں بہت مدد دی۔ آخر کار وہ کالی کٹ کا قاضی مقرر ہوا۔

اسی طرح ہندوستان کے مشرقی ساحل یعنی کارومنڈل پر بھی مسلمان بہت قدیم زمانے سے آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ تاریخ وصاف کا مصنف کہتا ہے کہ معبر (کارومنڈل) ہندوستان کی کنجی ہے۔ چند سال پہلے سندر پانڈے یہاں کا دیوان تھا جس نے اپنے تین بھائیوں کے ساتھ مختلف سمتوں میں قوت حاصل کی۔ ملک تقی الدین بن عبدالرحمان بن محمد الطیبی جو شیخ جمال الدین کا بھائی ہے اس راجہ کا وزیر اور مشیر تھا جس کو پٹم اور ملی پٹم اور باول کی ریاست راجہ نے سپرد کر دی تھی۔ ... سنہ ۶۹۲ ہجری (۱۲۹۳) میں دیوان مر گیا اور اس کی دولت اس کے وزیروں، مشیروں اور نائبوں میں بٹ گئی۔[۲] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ بھی مسلمان پہلی صدی ہجری سے موجود تھے چنانچہ جو پرانے سکے ان علاقوں میں دستیاب ہوئے ہیں ان پر ا، ہجری سے لے کر چھٹی صدی ہجری تک کے سکے موجود ہیں۔ بعد میں ایک بزرگ نطہر ولی اس علاقے میں تبلیغ اسلام کے لئے آئے اور ان کی وجہ سے کافی لوگ مسلمان ہو گئے۔ ان کا مزار تریچنا پلی میں موجود ہے۔[۳]

---

[۱] ہندو ثقافت پر اسلام کا اثر۔ صفحہ ۲۴ ۲۵۔

ان علاقوں کے علاوہ گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ اور کوکن کے علاقوں میں بھی شروع ہی سے عربوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ یہاں ولبھ رائے یا عربوں کی زبان میں بلہرا کی حکومت تھی۔ سب سے پہلا عرب سیاح اور تاجر سلیمان جس نے اپنا سفرنامہ ۲۳۵ ہجری میں ختم کیا ہے لکھتا ہے کہ اس کو اور اس کی رعایا کو مسلمانوں سے بڑی محبت ہے اور اس کی رعایا کا عقیدہ ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی لئے زیادہ بڑی ہوتی ہیں کہ وہ عربوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع میں بزرگ بن شہریار ایک جہاز ران ادھر آتا ہے تو ان علاقوں میں مسلمان اور عربوں کی بڑی آبادیاں اس نے دیکھیں۔ اس نے ایک نومسلم ہندو جہاز ران کا بھی ذکر کیا ہے جس نے بحری تجارت سے بہت دولت کمائی تھی۔ مسعودی چوتھی صدی ہجری کے شروع میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے بھی ولبھ رائے کی حکومت کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی راجدھانی کے ایک شہر میمو کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہاں عربوں اور مخلوط النسل مسلمانوں کی آبادی روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اب یہاں دس ہزار مسلمان آباد ہیں[1]۔

یہ تمام واقعات صرف جنوبی ہندوستان سے متعلق ہیں اور چونکہ ہماری بحث کا تعلق اور خاص کر بھگتی کی تحریک کا آغاز وہیں سے ہوا اس لئے ہم نے شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کے اثرات سے بحث نہیں کی۔ اس کے علاوہ یہ اثرات اور تعلقات محض ساتویں آٹھویں اور نویں صدی عیسوی تک محدود نہ رہے بلکہ یہ سلسلہ بہت تک بھی چلتا رہا۔ ساتویں صدی تک ہندوستان کی دینی تاریخ اس چیز کی شہادت پیش کرتی ہے کہ دینی معاملات میں ہر قسم کی راہنمائی شمالی ہندوستان کے حصہ میں تھی۔ برہمن مت، بدھ مت، جین مت اور بھگوت گیتا کے مبلغ سبھی مدھیا دیش اور اس کے مشرق، جنوب اور مغرب کے علاقوں میں پیدا ہوئے۔ لیکن ساتویں صدی کے ختم ہوتے ہی جب مسلمانوں نے جنوبی ہندوستان میں پہنچنا شروع کیا تو یہ راہنمائی بھی شمال سے ہٹ کر جنوبی علاقوں کے باشندوں کو مل گئی۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں مسلمان اپنے پورے جوش تبلیغ کے ساتھ اور اپنی قوم کی تمام فاتحانہ سربلندیوں کی عظمت لئے شہر بہ شہر پھرتے تھے اور جہاں انہوں نے کثرت سے اپنی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔ اسی علاقے میں سب سے پہلے شنکر اچاریہ نے بدھ مت کے خلاف برہمن مت کو مضبوط کرنے کے لئے منظم کوشش کی۔ شنکر ساحل مالابار کے ایک گاؤں میں آٹھویں صدی کے آخری ربع میں پیدا ہوا جبکہ مسلمانوں کی آمد و رفت اور آبادی کافی بڑھ چکی تھی اور اس علاقے کا بادشاہ مسلمان ہو چکا تھا۔

شنکر اچاریہ سے پہلے برہمن مت کے متعلق کوئی واضح نقشہ موجود نہ تھا۔ لوگ مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ان میں کہیں اتحاد فکر و عمل موجود نہ تھا۔ کثرت پرستی اور توہمات کی اتنی بھرمار تھی کہ حقیقت کا رشتہ کسی طرح ہاتھ نہیں آتا تھا۔ بدھ مت اور کسی حد تک جین مت نے جو چیلنج برہمن مت کے لئے پیش کیا تھا اس کا صحیح

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۸۱

جواب اگر بن پڑا تو شنکر اچاریہ کی فکری کاوش ہی سے اس نے خدائے مطلق کی مکمل یکتائی کا بڑے زور و جوش سے اعلان کیا۔ اس کے نظام فلسفہ کے لئے جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یعنی ادویت اسکے لغوی معنی دوئی سے انکار ہے یعنی اس کے خیال میں حقیقت مطلقہ میں کسی دوئی کی گنجائش نہیں۔ شنکر کی یہ تمام فکری کاوش برہمن مت کی بنیادی تعلیم اور اس کی مقدس الہامی کتابوں کی بنیاد پر پیش کی گئی بالکل اسی طرح جس طرح مسلمان متکلمین، معتزلہ اور اشاعرہ نے قرآن مجید کی بنیاد پر اپنی اپنی فکری کاوشیں پیش کیں۔ شنکر نے اپنے نظام فکر میں دو مختلف خداؤں کا ذکر کیا ہے۔ ایک برہما جو نرگن ہے اور دوسرا ایشور جو سگن ہے۔ برہما خدا کا بالکل ماورائی تصور ہے جو انسانی ذہن سے بالا ہے اور اس کی صفات کے متعلق کوئی اثباتی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اس کے دوسری طرف ایشور ہے جو اس کائنات کا خالق اور تمام صفاتِ حسنہ کا حامل ہے لیکن مطلقیت کے لحاظ سے برہما سے کم درجہ پر ہے۔ معتزلہ کے ہاں ایک تجریدی خدا کا تصور شروع سے موجود رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ خدا رحیم، کریم اور دوسری صفات حسنہ کا حامل ہے تاہم انسان ان صفات کی نوعیت کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ بیان کر سکتا ہے۔ اس کی صفات عین ذات ہیں اور ان کو صرف سلبی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان صوفیا میں یہ دونوں تصورات موجود ہیں۔ خدائے مطلق کی ایک وہ حالت ہے جس میں نہ وہ خالق ہے اور نہ رب۔ بلکہ اپنی ذات میں گم، ہر چیز سے ماوراء جس کے لئے ابن عربی نے "الاعماء" تاریکی مطلق یا نور مطلق کا نام رکھا ہے یہ مرتبہ ابن العربی کی اصطلاح میں سبحات الحرقہ کا ہے۔ جب اس کا نور تمام کثرتوں کو اپنی آگ میں جلا ڈالتا ہے۔ اس منزل میں وہ اپنی ذات میں تنہا و یکتا ہے اور کوئی شخص اس کو نہیں پا سکتا۔ اس کے بعد تنزلات کی پہلی منزل واحدیت ہے جس میں خدا اپنی اس تجریدی اور ماورائی حیثیت سے نیچے اتر کر کائنات کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کی یہ حیثیت ہے جس میں وہ خالق کائنات بھی ہے اور رب العالمین بھی ہے، رحیم بھی ہے اور معبود بھی۔ جو صوفیا اپنے کشفیات میں خدا کے مشاہدے کا ذکر کرتے ہیں وہ یہی خدا ہے جو مرتبہ واحدیت میں پہنچ اتر آیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی تصورات ہیں جو شنکر اچاریہ کے ہاں نرگن اور سگن یعنی برہما اور ایشور کے نام سے موجود ہیں۔

لیکن توحیدی مذاہب میں یہ تقسیم نہ کبھی تھی اور نہ تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ہمارا مذہبی شعور جس قسم کے خدا کا تقاضا کرتا ہے وہ صفات حسنہ کا حامل بھی ہے اور برتریں وجود مطلق بھی۔ اس سے بلند تریں وجود تصور میں نہیں آ سکتا۔ محبت اور خلوص کے جذبات اور کامل سپردگی اور توکل کے تصورات تبھی اخلاقی طور پر بار آور ہو سکتے ہیں جب ہم اس خدائے تعالیٰ کو رب اور خالق سمجھیں اور اس سے بالا کوئی اور نہ ہو۔ اس بنیادی اختلاف کے باعث شنکر اچاریہ کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ بھگوتی دین کے تصورات کے خلاف آواز اٹھائے۔ اگرچہ بدھ مت اور جین مت کے خلاف متحدہ محاذ کی شکل قائم کرنے کے لئے برہمنوں نے بھگوتی کے پیروؤں کو اپنے حلقے میں شامل کر لیا تھا لیکن اب جبکہ بدھ مت اور جین مت اپنی مقبولیت کھو چکے تھے اور برہمن مت اپنا پرانا وقار حاصل کر چکا تھا تو اس متحدہ محاذ کی سیاسی اہمیت ختم ہو چکی تھی اور اس لئے شنکر اچاریہ نے پورے جوش سے بھگوتیوں کے خلاف تنقید شروع کی اور ان کی توحید کے مقابل وحدت وجود

کے نظریئے کو پیش کیا۔ اس حملے سے لازمی طور پر بھگوتی کے پیروؤں میں اپنے اعتقادات اور تصورات کی حفاظت کا شدید جذبہ پیدا ہوا۔ اس جذبے نے ان کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو اس متحدہ محاذ کو قائم رکھنے کے آرزومند تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اب اکثریت سے بالکل بے تعلق ہو جائیں۔ انہوں نے برہمن مت کے اندر رہنا پسند کیا اگرچہ وہ شنکر اچاریہ اور اس کے پیروؤں کے دلائل کی مکمل طور پر تردید بھی کرتے رہے۔ اس گروہ کا سردار مشہور فلسفی رامانوج تھا۔ دوسرا گروہ جو اقلیت میں تھا اس نے اس متحدہ محاذ کو ختم کر ڈالا اور برہمن مت کے ساتھ اپنے فکری تعاون کو ختم کر کے پھر سے سانکھیہ یوگ نظامِ فکر کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ اس گروہ کا سردار مادھو تھا۔ یہ تبدیلی بارھویں صدی عیسوی میں رونما ہوئی اور اس سے بھگتی کی تحریک ایک نئے روپ میں سامنے آئی۔

اس جدید شکل میں اس کے مختلف فکری اجزا کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب پر اسلام نے بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔

ان سب سے اہم تصور توحید کا ہے۔ ان کے نزدیک خدا ایک اور صرف ایک ہے جس کے لئے ان کے ہاں بھگوت کا نام ہے، کبھی اس کو نارائن، پُرش یا واسدیو کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ چونکہ آغاز میں بھگوتوں نے سانکھیہ یوگ نظامِ فکر سے استفادہ کیا تھا اس لئے ان کے ہاں تخلیق کائنات کے متعلق یہ تصور موجود تھا کہ خدا نے اس کو مادہ سے پیدا کیا اور مادہ جس کو وہ پراکرتی کا نام دیتے ہیں ازل سے قدیم ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آغاز میں ان کے ہاں بھی یہی تصور تھا کہ خدا نے تمام کائنات اور مادہ کو عدم سے پیدا کیا۔ تمام روحوں کا مصدر و منبع وہی ذات خداوندی ہے لیکن تخلیق کے بعد وہ مستقل وجود کی حامل ہیں اور ناقابلِ فنا۔ ہندو ضمنیات کے بے شمار دیوتا، برہما، شیو وغیرہ سبھی اس کی تخلیق ہیں ان کی مدد سے وہ کائنات پر حکومت کرتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر تمام کام انہی کے ذمہ ہیں لیکن اپنی مخلوق کی بھلائی کی خاطر وہ کبھی کبھی انسانی لباس میں اس دنیا میں آموجود ہوتا ہے۔ سب سے بہترین اوتار دو ہیں، رام چندر اور کرشن۔

نجات کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اس خدائے واحد کے سامنے خلوص و توکل کا مکمل اظہار ہو۔ اس خلوص و عبودیت کا مرجع صرف ذات خداوندی ہے۔ عبرانی زبان میں "الوہیم" کا لفظ دو مختلف معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ کبھی اس کا مفہوم خدائے مطلق ہوتا ہے اور کبھی ان فرشتوں کے لئے بھی آتا ہے جو اس کے فرمانبردار بندوں کی حیثیت میں اس کے حکم کو بجا لاتے ہیں۔ اسی طرح بھگتی کے پیروؤں میں "دیوتا" کے لفظ میں یہی دُہرا مفہوم ہوتا ہے۔ دیوتا سے ان کی مراد کبھی خدائے مطلق و واحد ہوتا ہے اور کبھی یہ لفظ ان اوتاروں اور دیوتاؤں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جن کو اس خدائے مطلق نے تخلیق کیا یا ان کی شکل میں اس دنیا میں آیا اور اس ثانوی معنوں میں اگر عبودیت اور خلوص کا اظہار کیا جائے تو گویا یہ خدائے مطلق ہی کی عبودیت کے مترادف قرار دیا جائے گا لیکن اس فرق کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ان کے ہاں اس چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ماتحت دیوتاؤں کے سامنے جو اظہار خلوص ہوتا ہے وہ صرف ان کی عزت، توقیر اور بزرگی کا اقرار ہے۔

صحیح عبودیت، اخلاص، محبت کا حقدار اور مستحق صرف وہی ذات خداوندی ہے جو واحد و بے مثال ہے۔ بھاگوتی دین کی تمام مقدس کتابوں میں اس تصوّر کو بڑی سختی اور شد و مد سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کو ماننے والوں کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائیں۔ وہ خدائے مطلق ان کی اصطلاح میں ایکا نتن (واحد) ہے۔

(۲) اعمال کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ہر عمل، یا کرم کا پھل لازمی ہے۔ اگر کوئی نیک کام اپنے پھل کی غرض سے کیا جائے تو ممکن ہے کہ موت کے بعد کی زندگی میں اس سے انسان کو آرام و چین میسر آسکے۔ لیکن یہ آرام محض عارضی ہوگا کیونکہ جونہی اس کے اثرات ختم ہونگے انسان پھر اس دنیا میں آموجود ہوگا اور اسے آواگون کے دائمی چکّر میں پھر سے مبتلا ہونا پڑیگا۔ اگر اعمال بے غرض ہوں یا ان کی اصطلاح میں نشکام ہوں یعنی ان کا مقصد کوئی دنیاوی یا اُخروی فائدہ نہ ہو بلکہ محض بھگوت یا خدائے تعالےٰ کی رضاجوئی اور اس کی محبت سے سرانجام دئے جائیں تو ایسے اعمال اس انسان کے لئے ابدی فائدہ کا باعث ہونگے۔ خود خدا اس شخص کے دل میں مقیم ہوگا جس سے بھگتی اور محبت و خلوص کا صحیح جذبہ پیدا ہوگا اور یہی بھگتی اس کی نجات کا باعث ہوگی۔ یعنی نجات کا دارومدار اعمال اور حُسنِ نیت یا ایمان دونوں کی آمیزش پر منحصر ہے۔

(۳) انسانی روح اس دنیا میں آنے سے پہلے خدائے تعالےٰ کا حصّہ تھی اور اسی سے ظہور میں آئی۔ لیکن ظاہر ہونے کے بعد وہ ایک علیٰحدہ اور منفرد وجود کی حامل ہوتی ہے اور کوئی چیز اس کے مشخص وجود کو ضائع نہیں کرسکتی۔ عام ہندو عقیدے کے مطابق یہ روح آواگون میں مبتلا رہتی ہے جس سے اس کو نجات صرف بھگتی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ چند دیوتاؤں کی روحیں ایسی ہوتی ہیں جو پیدائش سے ہی نجات یافتہ ہوتی ہیں لیکن انسانوں کی روحوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ ان کی چار قسمیں ہیں: (ا) وہ جو اس دنیا کے بندھنوں میں اس طرح پھنسی ہوتی ہیں کہ ان کے لئے نجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ (ب) بعض وہ لوگ ہیں جن کے قلب میں مکتی پانے کا جذبہ اور تمنّا پیدا تو ہوتی ہے لیکن وہ اسے حاصل کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ (ج) وہ لوگ جن کے قلب صاف ہیں اور جن کے دل میں خدائے تعالےٰ کے لئے خلوص و محبت کا جذبہ موجزن ہے اور اس طرح وہ مکتی سے بہرہ اندوز ہونے والے ہیں (د) یہ وہ لوگ ہیں جو مکتی حاصل کرچکے ہیں جو خدا تعالےٰ کے قدموں میں ایک مسلسل اور باشعور وجود کے حامل ہیں۔ ان کی بہترین راحت و خوشی خدا کی رضاجوئی اور اس کی خدمت ہے۔ وہ اس کی ذات میں مدغم نہیں ہوتے بلکہ اس کی صفات حسنہ کے اکتساب سے مکمل سعادت کے حامل ہوتے ہیں۔

شنکر اچاریہ کی ویدانت اور مسلمان صوفیا کے وحدت وجودی نظرئے کے مطابق انسانی روح اور خدا میں غیریت اور دوئی کا تصوّر بالکل ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک تو انسان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ ہی یہ ہے کہ وہ جہالت سے نکل آئے اور تمام کائنات اور خدائے مطلق کی وحدت کا صحیح علم حاصل کرکے اپنی علیٰحدہ اور منفرد ہستی کو ہمیشہ کے لئے ختم کردے۔ مسلمان صوفی شعراء کے ہاں یہ تصوّر عام طور پر پایا جاتا ہے کہ خدا ایک سمندر ہے جس میں انسانی خودی یا انا محض ایک قطرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور یہ قطرہ بھی کوئی علیٰحدہ وجود نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے برعکس توحیدی مذاہب نے

ہمیشہ اس نظریئے کی مخالفت کی ہے۔ ان کے نزدیک انسان اور خدا کی ذات میں اتحاد و فصل کا رشتہ نہیں۔ خدا ایک نصب العین کی حیثیت میں ضرور ہے لیکن اخلاقی اور روحانی بلندی کا تقاضا مکمل مطابقت یا مماثلت (illegible) نہیں بلکہ دوری، فراق اور علیحدگی ہے۔ اگر خدا اور انسان دونوں ایک ہیں تو اخلاقی زندگی اور روحانی ارتقا ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اقبال نے گلشنِ راز جدید میں ایک جگہ کہا ہے:

وجود کوہسار و دشت و در ہیچ — جہاں فانی، خودی باقی، دگر ہیچ
دگر از شنکر و منصور کم گوئے — خدا را ہم براہِ خویشتن جوئے
بخود گم بہرِ تحقیق خودی شو — انا الحق گو و صدیق خودی شو

اقبال کی نگہ میں خدا تک پہنچنے کا صرف یہی بہترین راستہ ہے کہ انا الحق کہا جائے۔ یعنی اپنی انا اور خودی کو قائم رکھ کر خدا کا دیدار کیا جائے۔

بھگتی کے پیروؤں کا یہ نقطۂ نگاہ جو اُنہوں نے ہندو فکر یعنی ویدانت کے خلاف پیش کیا اس حقیقت کا بہترین اظہار ہے کہ ان کا مسلک وحدت وجودی کی بجائے خالص توحیدی تھا اور یہی واقعہ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ کس حد تک اسلام سے متأثر تھے۔

---


# سرسیّد کے مذہبی افکار (انگریزی)

مصنفہ بشیر احمد ڈار

سید احمد خاں ایک ترقی پسند اور روشن خیال تحریک کے علمبردار تھے اور اُنیسویں صدی میں ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُنھوں نے اسلامی تعلیمات کی جو تشریح اور توضیح کی اس کو اس کتاب میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

قیمت دس روپے۔

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور